

امتیاز احمد (اسسٹینٹ پروفیسر)  
شعبہ اردو، راجاسنگھ کالج، سیوان  
مواد برائے بی اے (اردو آنرز) سال دوم

## اقبال کی نظم مسجد قرطبہ: ایک جائزہ

”مسجد قرطبہ“ اقبال کی مشہور و معروف نظم ہے، جو ان کے مجموعہ کلام ”بالِ جبریل“ میں شامل ہے اور جسے انھوں نے ہسپانیہ کی سرزمین بالخصوص قرطبہ میں لکھی ہے۔ اس نظم میں اقبال کا فکر و فن اپنے مرتبہ کمال پر نظر آتا ہے۔ اس کا شمار اقبال کی شاہکار نظموں میں ہوتا ہے۔

”مسجد قرطبہ“ آٹھ بندوں پر مشتمل ہے اور ہر بند میں ایک مرکزی خیال پایا جاتا ہے۔ نظم کے پہلے بند میں اقبال نے وقت اور زمانہ کی حکیمانہ اور فلسفیانہ بحث کرتے ہوئے اپنے حریک نظریہ حیات کو پیش کیا ہے۔ وقت کی بہاؤ اور اس کی روانی کا فنکارانہ انداز ملاحظہ کیجیے:

سلسلہ روز و شب نقش گر حادثات  
سلسلہ روز و شب اصل حیات و ممات  
سلسلہ روز و شب تارِ حریرِ دورنگ  
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات  
سلسلہ روز و شب ساز ازل کی فغاں  
جس سے دکھاتی ہے ذات زیرو بم ممکنات  
تجھ کو پرکھتا ہے یہ مجھ کو پرکھتا ہے یہ  
سلسلہ روز و شب صیرفی کائنات  
تو ہے اگر کم عیار میں ہوں اگر کم عیار  
موت ہے تیری برات موت ہے میری برات  
تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا  
ایک زمانے کی روجس میں نہ دن ہے نہ رات  
آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر

کارِ جہاں بے ثبات! کارِ جہاں بے ثبات  
اول و آخر فنا ظاہر و باطن فنا  
نقش کہن ہو کہ نو منزل آخر فنا

اقبال کہتے ہیں کہ سلسلہ روز و شب سے ہی زندگی کے تغیرات و انقلابات رونما ہوتے اور جملہ حادثات و واقعات وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ اس میں حرکت و عمل اور روانی و بہاؤ کی ایک کیفیت پائی جاتی ہے جو اصل زندگی ہے اور اس کا سکون موت ہے۔ یہ سلسلہ روز و شب اپنے وجود میں ریشم کے دو تار سیاہ و سفید رکھتا ہے جس سے ذات اپنی صفات کی قبا تخلیق کرتی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے تمام جلالی اور جمالی صفات زمانے میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات و حادثات سے نمایاں ہوتے ہیں اور جو چشم بینا رکھتا ہے اس کا بھرپور مشاہدہ کرتا اور نصیحت اخذ کرتا ہے۔ رات اور دن کا یہ سلسلہ جسے اقبال نے زمانہ کا نام دیا ہے دراصل ازل کے ساز کا وہ آہ و فغاں ہے جس کے سبب فطرت ممکنات زیر و بم یعنی عروج و زوال کو نمایاں کرتی ہے۔ زمانہ کی حیثیت صیرفی کائنات کی ہے۔ جو حیاتِ انسانی کے اچھے اور بُرے اعمال کو پرکھتا اور اس کا ثعین کرتا ہے اور جس شخص کی خودی ضعیف و ناقص ہوتی ہے اس کے حصے میں موت کے سوا کچھ نہیں ہوتا اور زمانہ اسے فراموش کر دیتا ہے برخلاف اس کے جس بندہ کی خودی عشق لازوال سے مستحکم اور پلندار ہوتی ہے اس کے حصے میں دائمی زندگی ہوتی ہے۔ موت اس کے وجود کو مٹاتی نہیں بلکہ مزید نکھارتی ہے۔ سلسلہ روز و شب کی حقیقت یہ ہے کہ اس میں نہ دن ہے نہ رات بلکہ اس میں پیہم حرکت اور بہاؤ ہے سکون نہیں ہے۔ بند کے آخر میں اقبال نے اس حقیقت کو شاعری کا حسین جامہ پہنانے کی کامیاب سعی کی ہے کہ اس کائنات میں علم و ہنر کے جتنے بھی معجزے نمایاں ہیں یا نمایاں ہوں گے وہ سب فانی ہیں اس لیے کہ کارخانہ علم یا کارِ جہاں کو ثبات حاصل نہیں ہے۔ انسان کی بنائی ہوئی ہر چیز کا ظاہر اور باطن سب فنا ہو جانے والی ہے خواہ وہ چیز نئی ہو یا پرانی۔

دوسرے بند میں پہلے بند سے تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ یہ صحیح ہے کہ انسان کے تخلیق کردہ نقوش کو ثبات حاصل نہیں ہے تاہم جس شے یا جس نقش کی تخلیق میں مردِ مومن کا عشق اور اس کا خونِ جگر شامل ہوتا ہے اس کے حصے میں فنا نہیں ہوتی بلکہ اس پر ثبات کا رنگ غالب ہوتا ہے کیونکہ مردِ خدا کا عمل عشق لافانی اور عشق حقیقی سے فروغ پاتا ہے لہذا عشق کی طرح اس کا عمل بھی لافانی ہو جاتا ہے۔ اس بند میں اقبال نے جس جذبہ عشق کو صراحت اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے وہ اردو کے عام شعراء سے قطعاً جداگانہ ہے۔ اقبال کا عشق حد درجہ فعال و متحرک ہے۔ اسے عشق حقیقی کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اقبال نے اس عشق کو بڑی وسعت عطا کی ہے۔ یہ عشق جملہ تخلیق و عمل کا محرک حقیقی ہے۔ اس عشق میں خلا قانہ صفت پائی جاتی ہے۔ یہ عشق اپنے اندر بے

پناہ قوت و طاقت رکھتا ہے۔ اسی عشق کی بدولت امام حسین عالی مقام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے باطل کے خلاف آواز بلند کی اور حق کی خاطر اپنی جان عزیز کو قربان کر دیا اور لافانی حیات حاصل کر لی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسی عشق کی بدولت اللہ کی خوشنودی اور اس کی رضا کے لیے نارِ نمرود کو گلے لگا لیا تو انہیں ایسی حیات ابدی حاصل ہوئی کہ ان کے کارہائے نمایاں اور ان کے عشق کو آج بھی زمانہ یاد کرتا ہے اور قیامت تک یاد کرتا رہے گا۔ یہ عشق جب انسان کے رگ و پے میں سما جاتا ہے تو اسے جہاں روحانیت عطا کرتا ہے وہیں اشیاء کے حقائق کا علم بھی بخشتا ہوا نظر آتا ہے۔ بند کے اشعار ملاحظہ کیجیے جن میں اقبال نے اپنے فلسفہٴ عشق کے مختلف رنگ و آہنگ کو بے نقاب کرنے کی کامیاب سعی کی ہے:

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثبات دوام  
 جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام  
 مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ  
 عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام  
 تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو  
 عشق خود ایک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام  
 عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا  
 اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام  
 عشقِ دمِ جبریل، عشقِ دلِ مصطفیٰ  
 عشقِ خدا کا رسول، عشقِ خدا کا کلام  
 عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گلِ تابناک  
 عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاسِ الکرام  
 عشقِ فقیہِ حرم، عشقِ امیرِ جنود  
 عشق ہے ابنِ السبیل اس کے ہزاروں مقام  
 عشق کے مضراب سے نغمہٴ تارِ حیات  
 عشق سے نورِ حیات عشق سے نارِ حیات

اقبال کا کہنا ہے کہ گرچہ عشق کی راہ پر خار ہوتی ہے اور زمانہ سیل کی مانند ہوتا ہے تاہم عشق میں وہ قوت و طاقت ہوتی ہے کہ وہ راہِ عشق کی مزاحمتوں کو اپنے خاطر میں نہیں لاتا اور زمانہ پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے اور اپنے نیک مقاصد کے حصوں کی خاطر اپنا سفر یقین محکم کے ساتھ جاری رکھتا ہے۔ اس

عشق کے کلینڈر میں عصر حاضر کے علاوہ بھی بہت سے زمانے پنہاں ہوتے ہیں جن کا کوئی نام نہیں دیا جاسکتا۔ اس رمز سے وہی آشنا ہوتا ہے جس کی خودی عشق کے توسط سے مستحکم ہوتی ہے اور جسے اپنی ذات اور خدا کی ذات کا عرفان حاصل ہوتا ہے یہ عشق اتنا پاکیزہ اور اس کا مقام اس قدر اونچا ہے کہ اقبال نے اسے دمِ جبریل اور دلِ مصطفیٰ سے تعبیر کیا ہے۔ اسی عشق کی بدولت کائنات کا ظہور ہوا اور رسول خدا اور کلامِ خدا معرضِ وجود میں آئے گویا یہ عشق ایک طرح سے آسمانی جوہر ہے جس کے سبب انسان کا مقام اونچا اور اس کا مرتبہ بلند ہوتا ہے۔ انسان کی تمام تر تباہی، توانائی اور روحانیت اسی عشق کی مرہون منت ہیں۔ یہ عشق سخی میخوار کے شرابِ ناب سے لبریز ایک ایسا پیالہ ہے جس سے ہر خاص و عام اپنے اپنے ظرف کے مطابق فیض یاب ہوتا ہے۔ یہ عشق جہاں شریعت و طریقت و حقیقت کا محافظ ہے وہیں اللہ کی راہ میں جنگ کرنے والے مجاہدوں کی فوج کا امیر بھی ہے جو باطل کے خلاف جنگ پر آمادہ کرتا ہے اس عشق کے ہزاروں مقامات ہیں۔ اس کی حیثیت ایک مسافر کی ہے جو اپنے مقصد کے حصول میں اپنا سفر جاری رکھتا ہے اور اس دوران نئے نئے مقامات کا مشاہدہ کرتا ہے یعنی روحانی منازل طے کرتا ہے۔ اسی عشق کی بدولت زندگی کے ساز سے نغمہ جاری و ساری ہے۔ حیاتِ انسانی کی تمام تر روحانی قویں اور مخفی صلاحیتیں عشق ہی سے ظہور پذیر ہوتی ہیں اور اسی عشق کے توسط سے بندہ اعلیٰ مدارج پر فائز ہوتا ہے اور ابدی مقام حاصل کرتا ہے۔

تیسرے بند میں اقبالؒ مسجدِ قرطبہ جو عشق کا حاصل اور اسلامی فن کا شاہکار ہے سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ آے حرمِ قرطبہ تیرا وجود بلاشبہ عشق کی بدولت ہے لہذا عشق کی طرح تجھے بھی دوام حاصل ہے۔ زمانہ تو صرف انھی نقوش کونیست و نابود کرتا ہے جن میں عشق کا فقدان ہوتا ہے۔

اے حرمِ قرطبہ عشق سے تیرا وجود  
عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود

آگے اقبالؒ اس حقیقت کو بے نقاب کرتے ہیں کہ مصوری ہو یا فنِ تعمیر و سنگ تراشی، موسیقی ہو یا شاعری، فن کا کمال اور اس کا معجزہ یہ ہے کہ اس میں فنکار کا خونِ جگر یعنی جذبہٴ عشق شامل ہو۔ فنکار کے خلوص و محبت سے عاری فن میں نہ تو معروضی و موضوعی حسن کار فرما ہوتا ہے اور نہ ہی اُس کی حیثیت دائمی ہوتی ہے۔ اس میں دل نوازی اور نظر افروزی کا فقدان ہوتا ہے۔

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت  
معجزہٴ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

خونِ جگر جو اقبال کی شاعری میں عشق کے مترادفات میں سے ہے اس کا وصف یہ ہے کہ بڑے سے بڑے پتھر کے اندر بھی دل پیدا کر کے اسے سوز و سرور و سرود بخش دیتا ہے۔ بند کے آخر میں اقبال نے عظمتِ آدم اور مقامِ آدمی کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور اس حدیثِ قدسی کو شعر کا حسین جامہ پہنایا ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ مومن کا قلب عرشِ الہی کی مانند ہے جہاں اللہ جلوہ گر ہوتا ہے۔

عرشِ معلیٰ سے کم سینہ آدم نہیں  
گرچہ کفِ خاک کی حد ہے سپہرِ کبود

اقبال کہتے ہیں کہ گرچہ انسان کی تخلیق کھنکھاتی ہوئی مٹی اور انتہائی حقیر شے ”نطفہ“ سے ہوئی ہے اور بظاہر اُس کی حد نیلگوں فلک تک ہے تاہم جب یہ خاکی پیکر عشق کے جذبہ سے سرشار ہو کر اس کی رہبری میں اپنے نفس کا تزکیہ اور قلب کا تصفیہ کرتا ہے تو اسے جہاں روحانیت حاصل ہوتی ہے وہیں اس کا قلب اللہ کی جلوہ گاہ بن جاتا ہے اور وہ بذاتِ خود محرمِ رازِ درونِ میخانہ ہو جاتا ہے۔ فرشتوں کو گرچہ توفیقِ سجدہ میسر ہے لیکن سجدے کے سوز و گداز جو عبادت کی اصل اور اس کی روح ہے سے محروم ہیں اور اسی بنا پر انسان کا مقام فرشتوں سے اونچا اور بلندو بالا ہو جاتا ہے۔

پیکرِ نوری کو ہے سجدہ میسر تو کیا  
اس کو میسر نہیں سوز و گدازِ سجدہ

نظم کے چوتھے بند میں اقبال نے مردِ مسلمان کی صفات پر اپنے شاعرانہ اور فنکارانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ مسجدِ قرطبہ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے مسجدِ قرطبہ تیرے جلال و جمال سے مردِ مومن کا جلال و جمال نمایاں ہے۔ تیری بنیاد نہایت پائدار اور تیرے ستون ان گنت ہیں۔ شام کے صحرا میں تیرے ستونوں کی مثال ایسی ہے جیسے نخلستان میں کھجوروں کے درخت کی قطاریں جو حسین اور دلکش منظر پیش کرتی ہیں۔ تیرے درو بام پر ایمن کا نور برس رہا ہے اور تیرے منار کی بلندی کا یہ حال ہے کہ جیسے جبریل کی جلوہ گاہ جہاں رحمتوں اور برکتوں کا نزول ہوتا ہے۔ اگرچہ قومِ مسلم سرزمینِ ہسپانیہ سے مٹ گئی ہے تاہم صفحہٴ ہستی سے اسے کوئی نہیں مٹا سکتا کیونکہ یہ قومِ دینِ ابراہیمی کا محافظ اور سرِ کلیمی کے راز کو فاش کرنے والی ہے۔ قومِ مسلم کی زمین و آسمان کی کوئی حد نہیں ہے۔ اس کے سمندر کے موج کی طغیانی یعنی اس کے عروج اور کائے نمایاں سے پوری دنیا واقف ہے۔ مردِ مسلمان ایک ایسا سپاہی ہے جس کا زرہ لا الہ ہے جس کی بدولت وہ تیغِ اصیل کا مالک ہے۔ وہ فقیری میں بھی بادشاہی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ میدانِ کارزار میں تیغ و شمشیر کے سایہ سے

خوف زدہ نہیں ہوتا اور راہِ فرار اختیار نہیں کرتا کیونکہ اس کا یقین اللہ کی ذات پر ہوتا ہے جو انتہائی قوی اور اپنے کاموں پر غالب ہے، بند کے اشعار ملاحظہ کیجیے:

تیرا جلال و جمال مردِ خدا کی دلیل  
وہ بھی جلیل و جمیل، تو بھی جلیل و جمیل  
تیری بنا پاندار، تیرے ستوں بے شمار  
شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجومِ نخیل  
تیرے در و بام پر وادیِ ایمن کا نور  
تیرا منارِ بلند جلوہ گہ جبرئیل  
مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلمان کہ ہے  
اس کی اذانوں سے فاش سرِ کلیم و خلیل  
اس کی زمیں بے حدود، اس کا فلک بے ثغور  
اس کے سمندر کی موجِ دجلہ و دینوب و نیل  
مردِ سپاہی ہے وہ اس کی زرہ لالہ  
سایہ شمشیر میں اس کی پنہ لالہ

نظم کے پانچویں بند میں اقبال نے مردِ مومن کے اوصاف اور اس کی پوشیدہ صلاحیتوں اور قوتوں کو شاعری کے حسین پیرائے میں اجاگر کرنے کی سعیِ بلیغ کی ہے۔ بند اس طرح ہے:

تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز  
اس کے دلوں کی تپش اس کی شبوں کا گداز  
ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ  
غالب و کار آفرین کار و کشا کار ساز  
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولیٰ صفات  
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز  
اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل  
اس کی ادا دل فریب اس کی نگہ دل نواز  
نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو  
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

نقطہ پر کارِ حق مرد خدا کا یقین  
 اور یہ عالم تمام و ہم و طلسم و مجاز  
 عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ  
 حلقہ آفاق میں گرمی محفل ہے وہ

اقبال کا کہنا ہے کہ مسجدِ قرطبہ کی شان و شوکت اور اس کی عظمت و رفعت سے بندۂ مومن کے جذبہ  
 عشق، اس کے اخلاص و محبت، اس کے شب و روز کی حقیقت، اس کے ناز و نیاز، اس کے نیک مقاصد  
 اور اس کی بلند حوصلگی روشن اور نمایاں ہیں۔ مردِ مومن صفاتِ الہیہ اور اوصافِ حمیدہ سے متصف ہو کر  
 روحانی قوتوں سے مالا مال ہوتا ہے۔ اس کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ، اس کی آنکھیں اللہ کی آنکھیں، اس کا کان  
 اللہ کا کان، اس کی زبان اللہ کی زبان اور اس کے پیر اللہ کے پیر بن جاتے ہیں یعنی مردِ مومن کے  
 جملہ اعضاء و جوارح میں اللہ اپنا فعل جاری کرتا ہے کیونکہ وہ مردِ مومن کو اپنا محبوب رکھتا ہے۔ اللہ  
 تعالیٰ اسے کرامتوں کے تاج سے نوازتا اور اسے بلند مقام پر فائز کرتا ہے جس کے سبب مردِ مومن کار  
 آفرینی، کارسازی و کارکشائی کرتا اور فطرت کو مسخر کرتا ہوا نظر آتا ہے، اور یہ حدیثِ قدسی سے بالکل  
 ثابت ہے۔ اہل علم اس سے بخوبی واقف ہیں۔ آگے اقبال فرماتے ہیں مردِ مومن کی آرزوئیں اور امیدیں  
 دنیاوی اعتبار سے اور عام انسانوں کے مقابلے میں بہت قلیل ہوتی ہیں اور اس کے نیک مقاصد اور اس  
 کے عزم و حوصلے و ارادے عظیم اور تاریخ ساز ہوتے ہیں۔ وہ اللہ کی خاطر جیتا اور اللہ ہی کی خاطر دنیا  
 سے کوچ کرتا ہے۔ اس کی موت اس کے وجود کو نقصان پہنچانے سے قاصر ہوتی ہے بلکہ موت اس کی  
 زندگی کے مذاق (Test) کی تجدید کرتی ہے۔ اس کی اداؤں میں دل فریبی اور اس کی نگاہوں میں د  
 ل نوازی ہوتی ہے۔ وہ اپنے اغراض و مقاصد پر قوم و ملت کے اغراض و مقاصد کو مقدم رکھتا ہے جس  
 کی بنا پر اس کی سیرت و کردار سے اسلام کی حقانیت کا ظہور ہوتا ہے اور کفر دم توڑتا ہوا نظر آتا ہے،  
 اس کے اندر جمال بھی ہوتا ہے اور جلال بھی۔ وہ جہاں حلقہ یاراں میں ریشم کی طرح نرم ہوتا ہے  
 وہیں رزمِ حق و باطل میں فولاد ہوتا ہے۔ وہ زندگی کے جس بھی شعبے میں ہوتا ہے اس کی نیت خالص  
 اور اس کا دل بغض و عناد سے پاک ہوتا ہے۔ اس کے اندر عام انسانوں کی طرح وہم و طلسم و مجاز کی  
 مذمومہ صفت نہیں پائی جاتی بلکہ اس کا ایمان و یقین اتنا مستحکم اور اس کی خودی اتنی پابدار ہوتی ہے کہ  
 اس پر حوادثِ روزگار کا کچھ بھی اثر نہیں ہوتا۔ اس کا عشق مرشد اور اس کی عقل سلیم ہوتی ہے جو  
 ہمہ وقت زندگی کے ہر گام پر اس کی رہبری کرتی ہے۔ وہ زمین کی طرح متواضع اور سورج کی طرح  
 فیاض ہوتا ہے جس سے ہر نیک و بد اور ہر خاص و عام اپنے ظرف کے مطابق فیض یاب ہوتا ہے۔  
 حقیقت میں اقبال نے اس بند میں مردِ مومن کی اصطلاح میں اولیائے کاملین کے اوصاف اور ان کی  
 عظمت و رفعت کو بے نقاب کیا ہے جو حقیقی معنوں میں نیابتِ الہی کے منصب پر فائز ہو کر تسخیر

کائنات اور تسخیرِ فطرت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور یہی عشق و عقل کا حاصل اور اس کے اغراض ہیں -

مسجدِ قرطبہ کے چھٹے اور ساتویں بند میں اقبالؒ کا ذہنِ عہدِ ماضی کی طرف رواں دواں ہوتا ہے اور وہ ان مردانِ حق اور عربی النسل مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کا ذکر کرتے ہیں جنہوں نے عہدِ ماضی میں ہسپانیہ کو فتح کیا اور عظیم الشان کارہائے نمایاں انجام دے اور بے مثل مسجد کی تعمیر کرائی۔ یادِ ماضی اقبال کے لیے ایک المیہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ مسلمانانِ اندلس کی تاریخِ اقبالؒ کے قلب و جگر میں درد و کرب اور رنج و الم کا احساس جگا دیتی ہے اور یہ احساس اتنا شدید ہوتا ہے کہ اس کی آنچ اقبالؒ کے اسلوب اور اس کے صوتی ڈھانچے میں بھی ہم محسوس کرتے ہیں۔ یہ اقبالؒ کے فنِ شاعری کی وہ خوبی ہے جو انہیں دیگر اردو کے شعراء میں ممتاز و منفرد بناتی اور ایک بڑے فنکار کا رتبہ عطا کرتی ہے۔ بند کے اشعار دیکھیے:

آہ وہ مردانِ حق وہ عربی شہسوار  
حاملِ خلقِ عظیم صاحبِ صدق و یقین  
جن کی حکومت سے فاش یہ رمزِ غریب  
سلطنتِ اہل دل فقر ہے شاہی نہیں  
جن کی نگاہوں نے کی تربیتِ شرق و غرب  
ظلمتِ یورپ میں تھی جن کی خردِ راہ ہیں  
جن کے لہو کے طفیل آج بھی ہیں اندلس  
خوش دل و گرم اختلاطِ سادہ و روشن جبیں  
بوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے  
رنگِ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے

اندلس کے مردانِ حق، جو خلقِ عظیم اور صدق و یقین کے پیکر تھے اور جنہوں نے فقیری میں بادشاہی کر کے اہل یورپ کو عقل و شعور عطا کیا اور انہیں حیرت و استعجاب میں ڈال دیا، کے چھ سو سالہ تاریخ کے ذکر میں جو فکر کی گہرائی اور فن کی بالیدگی ہے اس کی مثال اردو شاعری پیش کرنے سے قاصر و عاجز نظر آتی ہے، اقبالؒ نے اپنے جذبات کے اظہار کے لیے جہاں الفاظِ کاموزوں استعمال کیا ہے وہیں اس کی ترتیب و تزئین میں بھی اپنے فنکارانہ کمالات کے جوہر دکھلائے ہیں۔



نظم کے ساتویں بند میں اقبال ایک ایسے عظیم اور صالح انقلاب کے متمنی نظر آتے ہیں جو ملتِ اسلامیہ کی زندگی کے جمود کو توڑ کر اس میں زندگی کی نئی وسعتیں اور جدید قوتیں پیدا کرنے میں معاون ثابت ہو نیز ذہنی غلامی سے نجات دلا کر اس کی عظمتِ رفتہ اور وقارِ کم شدہ کو پھر سے بحال کر سکے۔ بند کے اشعار ملاحظہ کیے:

دیدۂ انجم میں ہے تیری زمیں آسماں  
 آہ! کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذراں  
 کون سی وادی میں ہے کون سی منزل میں ہے  
 عشقِ بلاخیز کا قافلہ سخت جاں  
 دیکھ چکا المنی شورشِ اصلاحِ دیں  
 جس نے نہ چھوڑے کہیں نقشِ کہن کے نشاں  
 حرفِ غلط بن گئی عظمتِ پیر کشت  
 اور ہوئی فکر کی کشتی نازک رواں  
 چشمِ فرانسیس بھی دیکھ چکی انقلاب  
 جس سے دیگر گوں ہوا مغربیوں کا جہاں  
 ملتِ رومی نژاد کہنہ پرستی سے پیر  
 لذتِ تجدیدہ سے وہ بھی ہوئی پھر جواں  
 روحِ مسلمان میں ہے آج وہی اضطراب  
 رازِ خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں  
 دیکھئے اس بحر کے تہ سے اچھلتا ہے کیا  
 گنبد نیلو فری رنگ بدلتا ہے کیا

اس بند میں اقبال نے دورِ حاضر یا عہدِ ماضی میں جہاں جہاں انقلابی تحریکیں عمل میں آئی ہیں ان کا ذکر پسندیدگی سے کیا ہے کیونکہ ان انقلابی تحریکوں کی بدولت جہاں علم و حکمت کے راستے ہموار ہوئے ہیں وہیں حریت و مساوات و اخوت کے عظیم نعرے بھی بلند ہوئے۔ علاوہ ازیں مغرب کے دینی افکار میں آزادی بھی آئی۔ اس طرح اقبال ایک ایسے ہمہ گیر انقلاب کے آرزو مند ہوتے ہیں جو ملتِ اسلامیہ کے رویے اور ان کے ذہن و دل کے وہم و طلسم و مجاز کو دور کر کے یقین محکم اور عمل پیہم سے ہم آہنگ کرے اور متحرک اور فعال قوتوں سے ہمکنار کرے۔ اس انقلاب کے لیے وہ جذبہٴ عشق کو ناگزیر

قرار دیتے ہیں کیونکہ عشق ہی سے سوز یقین اور ذوقِ عمل پیدا ہو سکتا ہے اور نت نئی دنیا میں تخلیق ہو سکتی ہیں۔

نظم کا آٹھواں اور آخری بند کا آغاز ایک ایسے حسین اور دل نشیں منظر سے ہوتا ہے جہاں پہاڑوں کے پیچھے آفتاب غروب ہوتا اور شفق کی سُرخ چھوڑ جاتا ہے۔ شام کے اس دھندلکے اور خوب صورت منظر میں دخترِ دہقان کا سادہ اور پرسوز گیت فضاؤں کو نغمہ ریز کر دیتا ہے۔ اس رومان انگیز ماحول میں اقبالؒ دریائے کبیرؒ جہاں مسجد قرطبہ آباد ہے، کے کنارے مستقبل کو اپنے چشمِ دل سے دیکھ لیتے ہیں اور یہ مژدہ سناتے ہیں کہ پردہٴ تقدیر کے عقب سے ایک جہانِ نو طلوع ہونے والا ہے۔

وادیٰ کسار میں غرقِ شفق ہے سحاب  
لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب  
سادہ و پرسوز ہے دخترِ دہقان کے گیت  
کشتیِ دل کے لئے سیل ہے عہدِ شباب  
آبِ روان کبیر! تیرے کنارے کوئی  
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب  
عالمِ نو ہے ابھی پردہٴ تقدیر میں  
میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب

اس پس منظر کے بعد اب ذرا پیش منظر ملاحظہ کیجیے:  
جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی  
روحِ اُمم کی حیات کشمکشِ انقلاب  
صورتِ شمشیر ہے دستِ فضا میں وہ قوم  
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب  
نقش ہیں سب نا تمام خونِ جگر کے بغیر  
نغمہ ہے سوداے خام خونِ جگر کے بغیر

بند کے آخر میں اقبالؒ اپنے نظریہٴ حیات کو پیش کرتے ہوئے ملتِ اسلامیہ کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ جو قوم اپنے رویے اور اپنے ذہن و فکر میں تبدیلی کے عمل سے غافل ہے اور عشق کے جذبہ سے عاری ہے وہ قوم مردہ کی مانند ہے۔ زندگی حرکت و عمل سے عبارت ہے۔ زندگی جہدِ مسلسل کا نام ہے اور زندگی پیمانہٴ امروز و فردا سے بالا تر جاوداں اور پیہم رواں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نصرتِ اسی کو میسر ہوتی

ہے جو اپنے رویے کو بدلنے کا خواست گار اور جہد مسلسل کے لیے آمادہ ہو۔ زندگی کی روح اور اس کی اصل انقلاب کے کشمکش میں مضمر ہے۔ جو قوم ہر لمحہ اپنے اعمال کا محاسبہ کرتی رہتی ہے اس کی حیثیت دستِ قضا میں شمشیر کی مانند ہوتی ہے۔ اللہ رب العزت اسے زندگی کے ہر موڑ اور ہر منزل پر کامیاب و کامراں بناتا ہے۔ بند کے سب سے آخری شعر جس پر نظم اختتام پذیر ہوتی ہے، میں اقبال نے ایک عظیم حقیقت کی عقدہ کشائی کی ہے کہ خونِ جگر یعنی خلوص و صداقت و محبت کے بغیر جملہ علوم و فنون اور حیات انسانی کے تمام تر اعمال و افعال نامکمل ہیں جن سے خاطر خواہ نتائج اور فوائد کی امید نہیں کی جاسکتی۔

فنی لحاظ سے بھی یہ نظم حد درجہ کامیاب ہے۔ اس میں اقبال نے جہاں اپنے موضوع کی مناسبت سے الفاظ کا حسین انتخاب کیا ہے وہیں اس کی ترتیب و تزئین میں بھی اپنے کمالات کے جوہر دکھلائے ہیں جس کے سبب الفاظ معنی کے حُسن سے جگمگا اٹھے ہیں۔ علاوہ ازیں تشبیہات و استعارات میں ندرت و جدت اور تلمیحات و اصطلاحات میں ایک جہان تازہ کا ہمیں احساس ہوتا ہے۔ منظر نگاری بھی درجہ کمال پر دکھائی دیتی ہے۔ کہیں بھی خطیبانہ رنگ غالب نہیں ہے بلکہ ہر جگہ موسیقیت، شعریت اور غنائیت پائی جاتی ہے اور یہی کامیاب و عظیم شاعری کی پہچان ہے۔ مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ”مسجد قرطبہ“ فکر و فن ہر دو اعتبار سے اقبال کی ایک کامیاب اور شاہ کار نظم ہے۔ اس نظم میں انہوں نے اپنے فلسفہ عشق اور فلسفہ حیات کو شاعری کا جو حسین اور دلکش جامہ عطا کیا ہے اور جس طرح فلسفہ کو شاعری اور شاعری کو فلسفہ بنا کر پیش کیا ہے وہ عدیم المثال ہے۔ بلاشبہ اقبال جہاں ایک عظیم مفکر و حکیم ہیں وہیں ایک منفرد انقلابی شاعر بھی ہیں۔ ان کے انقلاب کی نوعیت عام اردو شعراء سے قدرے مختلف ہے۔